© rasailojaraid.com

ایک مشہور گم نام کی وفات

از حفیظ الرحمٰن العمری

عقل من پروانہ گشت وہم ندید
چوں تو شمع در ہزاراں انجمن

فارسی کا ایک مشہور مصرعہ ہے کہ جب قضا آتی ہے تو طبیب بے وقوف ہو جاتا ہے یہ تو ایک سچی حقیقت تھی جسے شاعر کا ادراک پا گیا مگر اسی سے ملتی جلتی ایک حقیقت اور ہے جو شاید شاعر کی نظروں سے اوجھل ہے وہ یہ کہ طبیب کی جب قضا آجاتی ہے تو سارا ہی عالم ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وفات پر پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے ان الفاظ سے مقالہ شروع کیا تھا "کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تھی تو سوال فوراً زبان پر آتا تھا ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا"

مجاہدِ جلیل حکیم مولانا فضل الرحمٰن صاحب صواتی کی وفات پر مقالہ بھی انھیں الفاظ کا اعادہ چاہتا ہے۔ موصوف بڑے ماہر اور نبض شناس حکیم تھے صرف تشخیص سے وہ بات بتا دیتے جو بعد میں ایکسرے سے ظاہر ہوتی تھی۔ ملک کے مشاہیر اطبا سے آپ کو شرفِ تلمذ یا دوستانہ تعلقات حاصل تھے۔

حکیم صاحب کہنے کو تو حکیم صاحب ہی کہلاتے تھے حالانکہ آپ صرف مریضوں کے لئے حکیم تھے۔ معقولات سے شغف رکھنے والوں کے لئے آپ بہت بڑے منطقی اور متکلم تھے منطق و فلسفہ کی ایک ایک کتاب پانچ پانچ چھ چھ اساتذہ سے سبقاً سبقاً پڑھ کر اس کے مطالب و راختلافات از بر کر چکے تھے اور حافظہ بھی ایسا کہ پتھر کی لکیر۔ بحث و مباحثہ میں بے تحاشہ کتابوں کے حوالے دیتے چلے جاتے عبارتیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرفر پڑھتے جاتے کبھی کوئی کتاب اٹھا کے دیکھنے کی زحمت نہ فرماتے چاہے بحث و تکرار تقریر میں ہو یا رسائل میں تحریری شکل میں۔ دارالسلام عمر آباد میں آپ معقولات ہی کے استاذ تھے،

تاریخی کام کرنے والوں کے لئے آپ کی ذات ایک ماخذ و مرجع کی حیثیت رکھتی تھی آپ کا دماغ تاریخی معلومات کا ایک خزانہ تھا۔ حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کی ایک اہم کڑی آپ کی ذات سے ملتی تھی۔ سرگزشتِ مجاہدین اور سیرت سید احمد شہید کو مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے پچیس سال کے مطالعہ کے بعد تکمیل کو پہنچایا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے مہر صاحب کو دادِ تحقیق دی جا رہی تھی۔ میری درخواست پر حکیم صاحب نے سیرت سید احمد شہید کا بالاستیعاب مطالعہ فرمایا۔ اور چھتیس ۳۶ صفحات پر مشتمل ایک تبصرہ میرے حوالے کر گئے جس میں مصنّف کی غلط معلومات اور غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے ان کی تصحیح کی گئی تھی۔ میں نے بڑے تامّل کے بعد اس کی ایک قسط مہر صاحب کو بھیج دی تو مہر صاحب تڑپ اٹھے۔ اور ذیل کا مکتوب میرے نام ارسال فرمایا۔

"برادرِ مکرم گرامی نامہ وسط فروری میں مِل گیا تھا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ حکیم صاحب محترم کی تحریر بہ تفصیل پڑھ کر جواب لکھوں اس میں تاخیر ہوتی گئی۔ اور خود میری دوسری مشغولیتیں بھی حائل ہوئیں۔ قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہیں خدا جانے میں نے سرحدِ آزاد کے مختلف حصوں میں کہاں کہاں کوہ پیمائی کی کہاں کہاں کی خاک چھانی، جملہ، بونیر، سوات، ضلع پشاور ضلع مردان، ضلع ہزارہ کے بیشتر مقامات دو دو تین تین مرتبہ دیکھے ایک ایک شخصیت کے حالات پوچھے۔ مگر حالات تو رہے ایک طرف بیشتر اصحاب ان شخصیتوں کے ناموں سے بھی آگاہ نہ تھے۔ حکیم صاحب محترم نے سرسری داستان سرائی میں اتنے حقائق بیان کر دئے کہ جن کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ وہی مولانا روم والی بات ہوئی۔ ع یار در خانہ و من گردِ جہاں می گردم

مولوی عبدالحق آروی مصنّف دُرِ مقال کے متعلق سید عبدالجبار شاہ نے بارہا بتایا کہ وہ شافعیوں کی بستی میں مقیم ہو گئے تھے جس کا نام غالباً لواگئی تھا یا ناوہ گی تھا۔ بونیر سے کوہ کڑا کڑ کو عبور کر کے سوات کی جانب اتریں دامن کوہ سے ذرا بلندی پر یہ بستی بائیں ہاتھ ملتی ہے۔ میں نے خدا جانے کس ذوق و شوق سے اس بستی کو دیکھا تھا اب معلوم ہوا کہ مولوی صاحب الاونڈ میں فوت ہو گئے۔ لاوارثہ میں نے دیکھا ہے الاونڈ نہیں دیکھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالکل اسی قسم کا واقعہ امام ابن تیمیہ کے سلسلہ میں پیش آیا۔ میں دمشق گیا تو سیکڑوں اصحاب سے امام موصوف کی قبر کے متعلق پوچھا۔ مختلف قبرستانوں میں پھرا۔ ان کے نگہبانوں یا بعض قبروں کے مجاوروں سے پوچھا مگر کوئی کچھ بتا نہ سکا۔ صوفیہ کے قبرستان کا پتہ بھی کہیں نہ ملا۔ چونکہ میں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا تھا اس لیے میں بہت مایوس اور افسردہ لوٹا۔ اب آپ کی بھیجی ہوئی کتاب سے یہ نکتہ حل ہوا۔

حکیم صاحب محترم نے مولوی صاحب کے بیشتر حالات تحریر فرما دئے۔ اور اپنے متعلق بھی بعض ایسی باتیں لکھ دیں جو کسی دوسرے سے معلوم نہیں ہو سکتی تھیں۔ میری کتاب "سرگذشتِ مجاہدین" طبع ثانی کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ اس میں مولوی عبدالحق آروی کے وہ تمام حالات آجائیں گے جو حکیم صاحب محترم نے بیان کئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ خود حکیم صاحب کے متعلق بھی ایک باب بڑھا دوں۔ ایسے بے نفس ایثار پیشہ اور حقیقی مجاہد کہاں ملیں گے وہ دور ہی گذر چکا جس کی آغوش میں ایسی شخصیتیں پرورش پاتی تھیں۔ حکیم صاحب محترم تو بہت اونچے ہیں۔ انہیں پہچاننے والا کون ہوگا؟

تاہم ایسی تصویریں کسی نہ کسی مرقع میں محفوظ ہونی چاہئیں۔ شاید کبھی سازگار وقت آئے۔ اور ایسی نگاہیں پھر پیدا ہو جائیں جو حقیقت شناسی کی میزان سے بہرہ مند ہوں۔

"آپ نے مجھ پر جو احسان فرمایا خدا شاہد ہے کہ اس کا کوئی بدلہ دعا کے سوا میں نہیں دے سکتا۔ مگر اسے اتمام پر پہنچا دیجئے۔ مسافر کو منزلِ مقصود پر پہنچا دیجئے عرضِ راہ میں نہ چھوڑیئے۔ اگر آمد و رفت میرے بس میں ہوتی اور وسائل بہ قدرِ ضرورت ساتھ دے سکتے تو ایک دن کا بھی توقف نہ کرتا۔ اور وہاں پہنچ جاتا۔ اب بہ دست دعا ہوں تحریر مکمل کرائیے اور جلد بھجوا دیجئے۔

حکیم صاحب محترم کی خدمت میں میرا سلام شوق پہنچا دیجئے۔ مجھے ان کے ارشادات کا انتظار رہے گا۔ "سید احمد شہید" کی اشاعت پر پانچواں سال گذر رہا ہے۔ آپ یقین فرمائیں گے اس پوری مدت میں ایک صاحبِ نظر بھی نہ ملا جو کتاب کے بنیادی مطالب و مقاصد پر مجھے مفید مشورے دے سکتا۔

حکیم صاحب محترم سے میں ایسے ہی مشوروں کا امیدوار ہوں۔ نیز پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا "جماعت مجاہدین" اور "سرگذشتِ مجاہدین" ان کی دسترس میں ہیں؟ انہیں بھی ایک نظر ملاحظہ فرمالیں اس لیے کہ پوری تحریک کے متعلق میری کاوشوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں بصحت و عافیت رکھے بجز اس کے کہ اپنی دعاؤں میں اس راقم کو بھی شامل فرمائیں

والسلام۔ مہر ۲۹ جنوری ۱۹۶۳ء

ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھی حکیم صاحب نے نمایاں کردار ادا کیا۔ برسوں جیلوں میں رہے۔ مصائب جھیلے، ترکِ وطن کر کے ایک بار افغانستان پہنچ گئے مگر دماغ میں آزادیٔ وطن کے لیے جہاد کا جو لاوا سلگ رہا تھا اس نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ پھر واپس آ کے گرفتار ہوئے۔ تین تین مرتبہ بنا بنایا ہزاروں کا مطب اجڑا مگر اس راہ کا ہر نقصان فتح و نصرت کا پرچم بن کر تصور میں لہرا رہا تھا۔ ع۔ درد میں لطف ہے۔ ایذا میں مزا غم میں خوشی۔

ہر میدان میں آپ کا کام انتہائی بے لوث اور بر بنائے اخلاص ہی ہوا کرتا تھا۔ آپ نے ہر خدمتِ ملک و قوم کچھ دینے ہی کے لئے کی۔ لینا آپ کی فطرت میں تھا ہی نہیں۔ جنگِ آزادی کے دوران آپ کی ڈھارس بندھانے والی رفیقۂ حیات داغ مفارقت دے گئیں جواں سال وحید لڑکے الطاف الرحمٰن نے سبھاش کی فوج میں سرگرمِ عمل رہ کر وطن کی راہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ ملک جب آزاد ہوا تو بڑے مجاہدوں کی فہرست میں آپ کا بھی نام تھا۔ ایک معقول جائداد آپ کے نام الاٹ ہوئی تو اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

جنگِ آزادی کے مشاغل میں مطب سے آپ کا تعلق بالکل ہی ٹوٹ چکا تھا۔ میدانِ کارزار سرد پڑنے کے بعد مطب کی طرف لوٹے تو وہ کسی طرح جم نہیں رہا تھا۔ معاشی حالت پتلی ہوتی جا رہی تھی۔ دوسری شادی کے بعد اولاد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ احباب نے مشورہ دیا کہ پاکستان چلے جائیں جہاں ان کے خاندان کے بیشتر احباب خوشحال اور اربابِ اقتدار تھے۔ خود آپ کے داماد پائندہ محمد خاں فوج کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ آپ کو بااصرار دعوت دے رہے تھے مگر سب کے جواب میں اس مردِ مخلص نے یہی کہا کہ ہم زندگی بھر پاکستان بننے کی مخالفت کرتے رہے اب پاکستان کس منہ سے جائیں گے

مطب چلتا کیا تھا گھسیٹے لے جا رہے تھے۔ اور اس پر کچھ ایسے اصول اپنے اوپر عائد کئے ہوئے تھے کہ تنگ بندھی آمدنی بھی کم سے کمتر ہونے لگی۔ مسجد اور مدرسے کے کسی بھی ملازم سے چاہے اس کا علاج کیسا ہی اہم اور اس کی دوا کتنی ہی قیمتی ہو ایک پائی وصول نہیں کرتے تھے۔ مدرسے کے ایک خوشحال استاد نے بتایا کہ حکیم صاحب نے کئی ماہ کے لیے قیمتی دوائیں انھیں دیں۔ وہ جیب سے نوٹ نکالنے لگے تو حکیم صاحب نے منع کر دیا۔ اور فرمایا کہ میں عہد کر چکا ہوں کہ مدرسہ اور مسجد کے ملازمین سے معاوضہ ہرگز وصول نہیں کروں گا۔ ایک طرف سے اصرار دوسری طرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے انکار، اس تکرار کا تماشہ دیکھنے بچے گھر سے نکل آئے تو مولوی صاحب کو ایک ترکیب سوجھی، جھٹ سے نوٹ کر بچوں کو دیدیئے۔ اور کہا کہ میں عیدی دے رہا ہوں آپ مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔ اور وہ عید الفطر کا دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ مولوی صاحب کا جملہ ختم ہونے بھی نہ پایا کہ حکیم صاحب ان سے لپٹ پڑے اور گلوگیر آواز میں کہنے لگے۔
واللہ تم رحمت کے فرشتے ہو۔ صبح سے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

حکیم صاحب کی کتاب زندگی میں ایسے نادر روزگار ایک دو نہیں سیکڑوں واقعات ہیں چونکہ قارئین میں اکثر کے لئے موصوف اجنبی ہیں۔ اس لئے ان واقعات کی اہمیت ایک کہانی سے بڑھکر کیا ہو سکتی ہے۔

حکیم صاحب کا سترہ سالہ سرخ و سپید سندر اور توانا بچہ عتیق الرحمٰن دوپہر کا کھانا کھا کر اسکول گیا۔ وہاں ایک حادثے میں اس کی موت ہوگئی عصر کے قریب لاش گھر لائی گئی۔ بوڑھاپے کی اولاد کیسی عزیز ہوتی ہے مگر اس صبر و استقلال کی چٹان کی زبان سے جو الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ وہ سامعین کو دیوانہ کر دینے کے لئے کافی تھے۔ حکیم صاحب فرما رہے تھے۔ "اچھا ہوا مر گیا ذرا چوری کی عادت تھی اس میں"

مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے حکیم صاحب کو بڑی گہری عقیدت تھی۔ عقیدت تو بہتوں کو بہت ساروں سے ہوتی ہی ہے مگر اس درجہ کی عقیدت حکیم صاحب ہی کے حصہ میں آئی تھی۔ مولانا سے متعلق جس قدر باتیں آپ کو معلوم تھیں شاید ہی اس باب میں آپ کا حریف مل سکے۔ تفسیر ترجمان القرآن کے انتساب کا انکشاف فرما کر حکیم صاحب نے علمی دنیا کو چونکا دیا۔ مولانا آزاد کا نام عزت سے کوئی لیتا تو اسے حکیم صاحب اپنا عزیز ماننے لگتے۔ چاہے دوسرے امور میں کتنا ہی اختلاف ہو۔ مولانا آزاد کی شان میں کسی نے ذرا بھی توہین کی تو حکیم صاحب کا اس سے بڑا دشمن کوئی نہیں ہو سکتا۔ ماہر القادری نے "پردہ اٹھنے کے بعد" لکھدیا تو حکیم صاحب کا غیظ و غضب دیکھنے کے قابل تھا۔ کئی دن گذر جانے کے بعد بھی بار بار یہی کہتے تھے کہ ایک ہی خواہش ہے کہ کراچی جاؤں اور ماہر القادری کا گلا گھونٹ دوں۔ حکیم صاحب مجاہد تھے جو کہتے وہی کرتے بھی تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ انہیں دنوں ۱۹۶۰ میں ماہر صاحب دارالسلام عمرآباد تشریف لائے۔ حکیم صاحب کا مکان عمرآباد سے پانچ میل کے فاصلہ پر تھا۔ دارالسلام کی ہر چھوٹی بڑی تقریب کے جیسے مہمان خصوصی حکیم صاحب ہی ہوا کرتے تھے۔ ارباب جامعہ نے عمداً حکیم صاحب کو ماہر صاحب کی تشریف آوری سے بے خبر رکھا۔ مبادا کوئی ناخوشگوار بات ہو جائے اور ادارے کے نام پر دھبہ لگ جائے۔ دار السلام میں آپ چند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سال استاذ رہے۔ ان چند دنوں کے تعلق سے آپ کو پورے عمرآباد ہی سے کہنا چاہیے جنون کی حد تک عشق ہو گیا تھا۔ ہفتہ میں دو ایک بار عمرآباد کا چکر نہیں لگا لیتے تو چین نہیں آتا تھا۔ ضعف بڑھا، دماغی توازن بگڑا۔ بینائی جواب دینے لگی۔ ہر چیز ذہن سے نکل گئی۔ احباب کی شناخت ناممکن ہو گئی۔ مگر عمرآباد کی زیارت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بچے اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تو ان سے لڑ پڑتے۔ بس میں جگہ نہیں ہوتی تو کنڈکٹر سے الجھ پڑتے۔ یہ سب جھمیلے اٹھا کر اپنی تعلیمی پاٹ کر عمرآباد تشریف لاتے رہے۔ دارالسلام کی ایک ایک درسگاہ سے رک رک کر گذرتے۔ جی میں آیا کسی استاذ سے مصافحہ کر لیتے۔ کسی کے پاس بیٹھ کر چائے پی لیتے۔ پھر دوسری بس سے واپس ہو جاتے۔ عمرآباد کے احباب گھر پر ملاقات کے لیے جاتے اپنا نام بتاتے۔ حکیم صاحب ہیں کہ اجنبی بنے بیٹھے رہتے۔ باتوں میں عمرآباد کا ذکر آجاتا تو چونک کر پوچھتے آپ عمرآباد سے تشریف لائے ہیں؟ جواب اثبات میں سن کر جزاک اللہ فرما دیتے اور کبھی کھڑے ہو کر معانقہ بھی کر لیتے۔ اگلے وقتوں کے لوگ بھی کیا خوب انسان تھے۔ چاہتے تو لوٹ کر چاہتے۔ نفرت کرتے تو ڈٹ کر کرتے۔ نفاق، تملق، ریا اور نمود و نام کی کوئی چیز ان کی زندگیوں میں بھٹک کر بھی نہیں گذرتی تھی۔ ان کا چہرہ دل کا آئینہ ہوتا اور زبان دل کی ترجمان۔

تکیلا لعلماء بعد علم شیا کی عملی تفسیر کرنے کیلیے بڑی طویل عمر مانگ کر لائے تھے۔ شوال ۱۳۱۲ھ کی ولادت تھی س۲۹۵ھ ۷ رمحرم جمعہ کی شب میں گیارہ بجے انتقال ہوا۔

زندگی تجربات سے بھرپور اور واقعات و حکایات سے لبریز تھی۔ آئے خالی ہاتھ اور گئے بھی اسی طرح خالی ہاتھ۔ لاکھوں کمائے اور کمائی کی کوئی نشانی بھی نہیں چھوڑ سکے۔ زندگی بھر دھوپ چھاؤں دیکھتے رہے مگر دھوپ بچنے کے لیے ایک سائبان بھی اپنا نہیں بنا سکے

کس کی راہ میں سب کچھ لٹا دیا ہم نے
پہلا تو وہ بھی نہیں جو کفن کے کام آئے

سردی اور بارش کے موسم میں مسجد کی پہلی صف میں موذن کے داہنے ہاتھ کھڑی ہونے والی شخصیت وفات سے کچھ روز قبل جماعت میں شریک ہونے سے محروم ہو گئی تو کیا؟ اس کا دل تو مسجد ہی میں اٹکا رہتا تھا۔ کسی بات کا ہوش نہیں رہتا لیکن اذان ہوتی تو جواب دینا کبھی نہیں چوکتا تھا۔ بیٹھے ہی بیٹھے نیت باندھ کر نماز شروع کر دیتے۔ قرات میں جہری فرماتے تھے۔ اکثر سورہ والفجر پڑھتے آہستہ آہستہ پڑھتے کوئی آیت چھوٹنے نہیں پاتی اور جب آخری آیت فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی پر پہنچتے تو آواز اتنی اونچی کر دیتے کہ گلی سے آدمی بخوبی سن لے۔ گلی کے لوگ جب ان کی قرات سن کر انکے جنتی ہونے کی بشارت دے سکتے ہیں تو پھر ان کی قرات سمیع و بصیر اور لطیف و خبیر کی بارگاہ میں کس مقام و مرتبہ کی مستحق ہو گی یہ ہماری شما کے قیاس و گمان سے ماوراء ہے۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے۔

© rasailojaraid.com